بیسویں صدی میں
عربی خودنوشت سوانحی ادب کا ارتقا

——————— ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی

بیسویں صدی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس صدی میں دیگر علوم وفنون کی طرح خودنوشت نگاری کے فن نے بھی غیر معمولی ترقی کی اور یہ ترقی ہمہ جہت رہی۔ اگر ہم اس ارتقاء کے اسباب وعوامل کا جائزہ لیں تو اس کی جڑیں بے حد گہری نظر آئیں گی۔ ان میں سے بعض کا تعلق ماضی کی مرحلہ وار تبدیلیوں اور انقلاب سے ہوگا تو بعض بالکل نئے اور جدید تقاضوں کی پیداوار ہوں گے۔

بلاشبہ عربی ادب میں بعض مثبت تبدیلیاں انیسویں صدی کے آغاز ہی سے آنی شروع ہوگئی تھیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعد میں یہی تبدیلیاں عربی ادب کے مکمل عروج کا سبب بن گئیں۔ دور حاضر میں علوم وفنون کے ارتقاء، سائنس اور ٹکنالوجی کی مقبولیت سے انسان کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ان سے اس کی شخصیت کے بعض خفیہ پہلو ابھر کر سامنے آئے۔ فطرت اور انسان کو سمجھنے کی کوشش بہت پہلے سے ہوتی رہی ہے۔ اس بارے میں انسانی نقطہ ہائے نظر مختلف اور بعض اوقات متغایر رہے ہیں۔ اسی نوعیت کی ایک کوشش ڈارون کی کتاب 'أصل الأنواع' ہے۔ اس میں پیش کردہ نظریۂ ارتقاء کا عصر جدید میں انسان کی تفہیم میں بڑا نمایاں رول رہا ہے۔[۱] اس کے بعد اس پر مزید بحث ومباحثہ ہوا اور باقاعدہ ایک علم 'علم الإنسان' (Anthropology) کے نام سے وجود میں آیا۔ ان کوششوں سے موجودہ انسان کو اپنی حقیقت معلوم کرنے اور اپنا مزاج اور طبیعت سمجھنے میں مدد ملی۔ پھر عصر حاضر کے ایک اور مفکر فرائڈ نے علوم انسانی میں علم نفسیات کی اہمیت کو اجاگر کر کے

نئی نسل کو نفسیاتی تحلیل و تجزیہ کا خوگر بنایا۔ اس نفسیاتی تجزیہ کے لیے انسان کے اپنے بیانات سے زیادہ اور کوئی چیز مفید نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ اس سے خودنوشت نگاری کو بے حد اہمیت حاصل ہوگئی۔[۲]

عربی زبان میں خودنوشت نگاری کے ارتقاء کے لیے مذکورہ علوم کے علاوہ بعض دوسرے عوامل بھی کارفرما رہے ہیں۔ خود جزیرہ عرب کی سیاسی اور سماجی صورت حال پر ایک ہلکی نظر ڈالنے سے بعض دوسرے مؤثر اسباب کی طرف رہنمائی ہوئی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں پوری دنیا کو جو مسائل درپیش تھے ان میں مختلف قوموں اور ممالک کے بقاو وجود کا مسئلہ خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ جنگ عظیم اول اور دوم کی تباہ کاریوں سے انسان اپنے مستقبل کے بارے میں سخت اندیشوں سے دوچار تھا۔ عالم اسلام اور خاص طور سے عالم عرب میں معقول اسباب کی بنیاد پر یہ اندیشے اور خدشات کچھ زیادہ ہی محسوس کیے جارہے تھے۔ ان کی وجہ سے لازماً قومی وجود اور شخصی وجود کے اثبات اور تحفظ کی طرف توجہات زیادہ مرکوز ہوئیں۔ پھر عالم عرب کی سیاسی اور سماجی صورت حال کا ایک عجیب وغریب پہلو اور بھی تھا۔ وہاں جن علاقوں پر اپنوں کی حکومت تھی وہ بھی عدل ومساوات کے سلسلے میں مخلص نہیں تھے۔ سماج کو مختلف حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا، جس کی وجہ سے قومی ذرائع و وسائل سے انتفاع کے فطری حق سے بہت سے لوگ محروم کردیے گئے تھے۔ جب مختلف اسباب کے باعث ان لوگوں کو کچھ آگے بڑھنے کا موقع ملا تو انھیں قوم کے بااثر لوگوں سے سخت کبیدگی اور نفرت ہوگئی اور اپنی حالت زار پر افسوس اور ندامت ہوئی۔ داخل کی اس خلجانی کیفیت نے انھیں کچھ کہنے اور لکھنے پر مجبور کردیا۔[۳]

مذکورہ بالا اسباب کی وجہ سے بیسویں صدی عیسوی کے عرب علماء نے اپنی ذات اور شخصیت کا گہرائی سے جائزہ لیا اور اسے دنیا کے سامنے ایک ادب کی زبان اور اسلوب میں پیش کیا۔ چنانچہ اس صدی کے اوائل ہی میں اظہار ذات کی بہت سی شکلیں معروف و متداول ہوگئیں، جن سے عربی شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوئے اور اس کی شناخت ممکن ہوسکی۔ اس کام میں متوسط طبقے کے ادباء نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ ان لوگوں کی کوششوں سے لوگوں کے اندر حریت، استقلال، دستور اور جمہوری نظام کے مفاہیم واضح ہوئے اور ان کے حصول

کے لیے منظّم جدوجہد کا آغاز ہوا۔اس مقصد کے لیے مصری ادباء نے ایک ایسا ادب پیش کیا جو قوم کی امیدوں اور آرزوؤں کے عین مطابق تھا اور جس میں کسی کی نقالی یا تقلید نہیں کی گئی تھی۔

جدید عرب خودنوشت نگاروں نے اپنے ذاتی اور انفرادی احساس کے تحت جو کچھ لکھا اس میں لوگوں کے جذبات کی بھرپور عکاسی تھی۔انھوں نے عربی ادب، مغربی ادب اور جدید افکار ونظریات سے مدد لی۔ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بحیثیت مجموعی اپنے مؤلفین کے فکری، روحانی، ادبی، معاشرتی اور سیاسی رجحانات سے متعلق حقائق سامنے لاتی ہیں۔بلاشبہ ان مؤلفین کا اپنے زمانے کی تبدیلیوں میں بڑا نمایاں رول رہا ہے۔ان مؤلفین نے اپنی ذات سے متعلق تحریروں کو جدید مفہوم اور اسلوب سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ان کے سامنے مغربی زبانوں کی خودنوشت سوانح عمریاں بطور نمونہ موجود تھیں۔انھوں نے اپنے فن میں کبھی کبھی اس قدر جدت اور ندرت پیدا کی کہ یہ مغرب کے خودنوشت قلم کاروں سے بھی آگے بڑھ گئے۔[۴]

جدید عربی ادب کی بعض خودنوشت سوانح عمریوں میں کچھ ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قدیم عربی خودنوشتوں میں موجود نہیں تھیں، مثلاً اپنے ماحول اور گرد و پیش سے لاتعلقی کا اظہار، قدیم موروثی افکار کے خلاف اظہار بغاوت، اپنے بعض جرائم کا صریحاً اعلان وغیرہ۔[۵] اسی طرح دور جدید میں خودنوشت سوانح سے مشابہ بعض دوسری اقسام کی تألیف و تدوین کا رواج پہلے کے بالمقابل زیادہ ہوگیا ہے۔یہ سوانح مذکّرات، اعترافات اور اسی طرح کے دوسرے ناموں سے موسوم ہوئیں۔پھر جدید دور میں افسانوی طرز پر خودنوشت سوانح عمری لکھنے کا فن بھی بہت آگے بڑھ گیا ہے۔قدیم عربی ادب میں بھی اس طرز تالیف کا وجود ملتا ہے، لیکن جدید دور میں اس کی مقبولیت اور رواج میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔اسی طرح خطوط اور مراسلات کی شکل میں اپنے جذبات کی ادائی کے لیے باضابطہ کتابیں تالیف کی گئیں۔توفیق الحکیم کی 'زہرۃ العمر' احمد امین کی 'إلی ولدی' اور محمد حسین کی 'ولدی' وغیرہ اسی قبیل کی تصنیفات ہیں۔

یوں تو ہر ادبی عمل کی ایک انفرادی اور امتیازی حیثیت ہوتی ہے، اس لیے اسے کسی دوسرے ادبی عمل کے ساتھ شامل کرنا مناسب نہیں ہوتا۔لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت

ہے کہ بعض ادبی اعمال میں اس قدر مطابقت ہوتی ہے کہ انھیں کسی تقسیم کے وقت ایک ساتھ رکھنے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا۔ ہمارے پاس موجود خودنوشت سوانح عمریوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم اغراض و مقاصد کی روشنی میں ان خودنوشت سوانح عمریوں کی تقسیم کر سکتے ہیں، کیونکہ ان کے مؤلفین کی دلچسپیاں باہم دگر مختلف ہونے کے باوجود بعض امور میں کبھی کبھی یکسانیت رکھتی ہیں۔ پھر خودنوشت کی مختلف بنیادی شرائط کی تکمیل میں بھی ان میں بعض کی بعض سے مطابقت ہوتی ہے اور بعض سے مغایرت۔ یہاں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ہر خودنوشت کا ایک محرک ہوتا ہے اور یہی محرک خودنوشت کے مضمون کا تعین کرتا اور اس کی غرض و غایت کو واضح کرتا ہے۔ اس طرح ہم جدید عربی خودنوشت سوانح عمریوں کو ان کے اغراض و مقاصد، طریقہ کار اور محرکات کی روشنی میں درج ذیل اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱- فکری خودنوشت سوانح عمریاں

جدید عربی خودنوشت سوانح عمریاں اپنے مؤلفین کے افکار و خیالات کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ ان سے ان مفکرین کی فکری خوبیاں اور امتیازی اوصاف ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذاتی تربیت میں کون سے عوامل اور محرکات کارفرما رہے ہیں۔ اور اس راہ میں انھیں کس طرح کی مشکلات اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب اور اس کے مظاہر سے تعارف کے بعد عرب مفکرین اور ادباء کی ایک قابل ذکر تعداد ان موروثی رسوم و رواج کے خلاف آواز اٹھانے لگی جو ایک زمانے سے ان کے معاشرے میں معروف و مشہور تھیں۔ جنگ عظیم اول کے بعد چونکہ انگریزوں نے عربوں سے کیے ہوئے اپنے وعدوں کی تکمیل نہیں کی اور پورا عالم اسلام خاص طور سے عالم عرب اس جنگ کا خصوصی نشانہ بنا، اس لیے عربوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوا۔ اور اس کے نتیجے میں غور و فکر کی مختلف راہیں ہموار ہوتی گئیں۔ اپنے تشخص اور انفرادیت سے متعلق جب سرگرم تلاش و جستجو ہوئی تو کچھ ادباء و مفکرین نے اپنے ورثہ سے مایوس ہوکر پوری تہذیب و تمدن کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اور کچھ دوسرے

اپنے ماضی ہی سے امیدیں وابستہ کیے رہے۔ پھران میں ایک تیسرا گروپ بھی تھا جو دونوں کے درمیان مطابقت اوراعتدال پیدا کرنے کے لیے سرگرم عمل تھا۔ ۶؎ ان تمام فکری رجحانات و میلانات سے عربوں کے سامنے مختلف نوعیت کے مسائل پیدا ہوگئے۔ مذکورہ فکری میلانات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف اور متغایر تھے کہ ان کی ابتدا ہی سے ایک الگ پہچان اور شناخت بن گئی۔ جدید عربی خودنوشت سوانح عمریاں ان تمام رجحانات کی عکاسی کرتی ہیں اوران میں اختلافات کے باعث یہ سوانح بھی مختلف حیثیات کی مالک ہیں۔اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عبدالرحمٰن شکری، عقاد، مازنی اوراحمدامین نے جوکچھ لکھا وہ ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔

فکری اعتبار سے جدید عربی خودنوشت سوانح کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان لکھنے والے زیادہ تر متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ معاشرتی اور سیاسی اعتبار سے پس ماندہ تھے۔ جب ان لوگوں کو یورپی علوم وفنون اورتہذیب وتمدن سے واقفیت ہوتی تو انھیں اپنے معاشرے اوراس کی رسوم وروایات سے نفرت ہونے لگی، چنانچہ ان لوگوں نے یورپ سے اخذکردہ جدید مفاہیم کی روشنی میں ادب و ثقافت کے قدیم مفاہیم کے گرد شکوک وشبہات کا اظہار کیا اوراپنی بات کو مستحکم کرنے کے لیے مغربی ادب و ثقافت کے بہت سے حصوں کا ترجمہ بھی کیا۔ جدید خودنوشت نگاروں میں جوادباء خاص طور سے مغرب سے متاثر نظرآتے ہیں ان میں طٰہٰ حسین، سلام موسیٰ اورتوفیق الحکیم قابل ذکر ہیں۔ان میں بعض ادباء ایسے بھی ہیں جنھوں نے مغرب ومشرق کے درمیان تال میل پیدا کرنے کی کوشش کی، اس سلسلے میں احمدامین اور عباس محمود العقاد کی کوششیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ البتہ ان ادیبوں میں میخائیل کی شخصیت وہ واحد شخصیت ہے جومغرب سے بے حد قریب ہونے کے باوجود اپنی فکری دنیا کی ایک علیٰحدہ تشکیل وتعمیر میں کامیاب ہوگئی۔ انھوں نے مشرق ومغرب سے بلند ہوکر لوگوں کے سامنےایک آفاقی نظریہ پیش کیا جس کی بنیادیں دونوں تہذیبوں سے مستعار تھیں۔ ۷؎ عباس محمود العقاد اپنی خودنوشت میں دیگر تالیفات کی طرح بیش تر سیاسی ومعاشرتی مسائل میں منفرد نظر آتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات پر بے حد اعتماد ہے۔ وہ اپنے افکار کو پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں، ان کی تحریروں میں ان کی انا اور انفرادیت سب سے نمایاں ہے۔

جدید عرب ادباء مغرب سے مستعار اپنے افکار اور اپنے معاشرے کے درمیان ایک خلا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس خلا سے پریشان ہوکر وہ جھنجھلاہٹ اور اضطراب کا شکار ہوجاتے ہیں۔ طہٰ حسین کی 'مستقبل الثقافۃ' اور 'فی الشعر الجاہلی' اس کی بین مثال ہے۔ اپنی کتاب 'الایام' میں بھی انھوں نے معاشرے کی تنگ دامنی پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا ہے اور لوگوں کو قدیم مفروضوں سے نکلنے کی دعوت دی ہے۔[۸] الغرض جدید عربی سوانح میں عصر حاضر کی ضروریات اور افکار و مسائل بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیے گئے ہیں۔ معاشرے کی فکری اور نفسیاتی مشکلات کے علاوہ ان میں ادبی و فکری مسائل کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید عربی شخصیت کے خدوخال اب بڑی حد تک نمایاں ہوگئے ہیں۔ یہ قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک امتیازی شان کی مالک بن چکی ہے اور اب یہ اس قابل ہے کہ مقامی اثرات سے بالاتر ہوکر پورے عالم میں اپنے انمٹ نقوش ثبت کر سکے۔

۲- سیاسی خودنوشت سوانح عمریاں

سیاسی قسم کی خودنوشت سوانح عمریوں میں انشا پرداز کے سیاسی میدان کی تصویر کشی ہوتی ہے۔ ان سے سیاسی دنیا میں اس کے کردار اور نمایاں کارناموں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس نوعیت کی خودنوشت سوانح عمریاں زیادہ تر دفاع کے مقصد سے لکھی گئی ہیں، کیونکہ ان کے مؤلفین کا سیاست کے بارے میں مخصوص نقطۂ نظر اور موقف رہا ہے، جس پر مختلف حلقوں سے انھیں تنقید و تعریض کا نشانہ بھی بننا پڑا، اس لیے اپنے افکار و خیالات اور اصول و ضوابط کی وضاحت ان کے لیے لازم تھی۔

جدید عربی ادب میں احمد شفیق کی کتاب 'مذکراتی فی نصف قرن'[۹] اس کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں اپنے بعض شخصی احوال کے ساتھ ۱۸۷۳ء سے ۱۹۲۳ء تک کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تفصیلات قلم بند کی ہیں۔ یہ کتاب مصر کی جدید تاریخ کا ایک بہترین ماخذ ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب میں خدیو توفیق کی حمایت اور عرابی پاشا کی مخالفت کے اسباب تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب اپنے مؤلف کے ایک خاص موقف کی

وضاحت اور دفاع کا کام انجام دیتی ہے۔

فی الواقع انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں مصر کے اندر جو سیاسی اور اصلاحی تحریکیں برپا ہوئی تھیں ان کی وجہ سے سیاسی یادداشتیں جمع کرنے کی روایت کافی مقبول ہوئی۔ ان تحریکوں کے قائدین نے خاص طور سے مختلف مسائل کے بارے میں اپنا مخصوص نقطۂ نظر واضح کیا۔ خود احمد عرابی پاشا نے 'کشف السقار من سرالأسرار' کے نام سے اپنے مذکرات قلم بند کیے۔ اسی طرز پر ان کے رفیق محمود فہمی نے اپنے ذاتی تاثرات قلم بند کیے۔ اس میں انقلاب کے دوران میں پیش آنے والے واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اسی طرح عبداللہ ندیم نے بھی انقلاب کے بارے میں اپنی یادداشتیں قلم بند کر کے احمد عرابی کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ یہ یادداشتیں بعض دوسرے خطوط اور مقالات کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں 'عبداللہ الندیم و مذکرات الشخصیۃ' کے نام سے شائع ہوئیں۔

احمد لطفی السید کی 'قصتہ حیاتی'، عبدالعزیز فہمی کی 'ہذہ حیاتی' اور محمد حسین ہیکل کی 'مذکرات فی السیاسۃ المصریۃ' اسی طرز کی خودنوشت سوانح حیات ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا مصر اور عرب کی سیاست میں بڑا اہم رول رہا ہے۔ سیاست اور فکر کے تعلق سے ان کے کچھ مخصوص نظریات تھے۔ ان میں سے بعض عوام کی عام سوچ سے ہم آہنگ نہیں تھے، اس لیے انھیں عوام کے مختلف اور متضاد ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے موقف کی باضابطہ وضاحت کے لیے ان میں سے ہر ایک نے اپنی خودنوشت لکھی اور اس میں سیاست، معاشرت اور فکری اصلاح کے تعلق سے اپنی سعی و کوشش اور جدوجہد کا دفاع کیا۔

مذکورہ بالا شخصیات میں سے لطفی السید کی خدمات اس لحاظ سے بے حد اہم ہیں کہ انھوں نے اپنی فکر و فلسفہ کی ترویج و اشاعت اور اس کے مطابق قوم کی اصلاح و تربیت کے لیے بے حد سنجیدہ اور مفید لائحہ عمل وضع کیا۔ اخبار الجریدہ کا اجرا، الحزب الوطنی کا قیام اور سرگرم شرکت، المصر للمصریین کا نعرہ اور فلسفہ ارسطو کی نمائندہ کتابوں کا ترجمہ، یہ سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ سیاست اور معاشرت سے قوم کو واقف کرانے کے لیے وہ یونانی فلسفہ کو خاصی اہمیت دیتے تھے۔ دوسری زبانوں سے عربی میں ترجمہ اور منتقلی کا کام انجام دینا لطفی السید کا طرۂ

امتیاز ہے۔ان سے پہلے اس کام کی طرح فتحی زغلول نے ڈالی تھی۔انھوں نے سیاست اور معاشرت سے متعلق جدید مغربی مفکرین کی بعض شہرہ آفاق تصانیف کو عربی زبان میں منتقل کیا۔اس سے لوگوں کے اندر حریت اور استقلال کا معنی اور مفہوم اور اس کے اصول و مبادی کا علم پیدا ہوا اور وہ دنیاوی ترقی کے لیے علمی تیاریوں کی ضرورت سے واقف ہوئے۔[۱۰]

محمد کرد علی، عبدالرحمٰن رافعی، محمد فرید اور ملک عبداللہ کے مذکرات کا شمار بھی سیاسی نوعیت کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ہوتا ہے۔ان میں سے اول الذکر دو کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔کرد علی نے اپنے مذکرات میں ان الزامات کا دفاع کیا ہے جو جنگ عظیم اول کے دوران عثمانی حکم رانوں سے دوستی کے سبب ان پر لگائے جاتے تھے۔اسی طرح ان پر شام میں فرانسیسیوں کے غلبہ کے دوران ان کی مدد کرنے کا الزام بھی لگایا جاتا ہے۔[۱۱] عبدالرحمٰن رافعی نے اپنے مذکرات میں سیاسی اور قومی نظریات کے علاوہ اپنے زمانے کی تاریخ کا ریکارڈ بھی محفوظ کر دیا ہے۔اس میں انھوں نے 'الحزب الوطنی' اور اس کے زعماء محمد فرید اور مصطفیٰ کامل کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔کتاب میں ان کی زندگی کے ابتدائی مراحل زمانی ترتیب کے ساتھ پیش کر دیے گئے ہیں۔اہم تاریخی واقعات کی تاریخیں بھی مذکور ہیں۔اس لیے تاریخ کے تعلق سے یہ ایک مفید کتاب ہے۔ یہ کتاب ان کی پیدائش ۱۸۸۹ء سے لے کر تاریخ اشاعت ۱۹۵۱ء تک کے حالات کو محیط ہے۔[۱۲]

۳- افسانوی خودنوشت سوانح عمریاں

انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں جو سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی نظریات مصر اور بیرون مصر فروغ پا رہے تھے، عرب مفکرین اور ادباء نے جس طرح انھیں اپنی دوسری تحریروں میں برتنے اور پیش کرنے کی کوشش کی اسی طرح انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں بھی ان کو جگہ دی۔ان ناولوں اور افسانوں میں یوں تو فرضی کردار پیش کیے جاتے ہیں اور ان کے پردے میں مؤلفین اپنے افکار و خیالات پیش کرتے ہیں، لیکن بعض ناول اور افسانے ایسے ہیں جن پر ایک معمولی سی نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے کردار فرضی نہیں بلکہ حقیقی ہیں

اور یہ کہ ان کا مصنف خود ان کا ایک بڑا ہیرو ہے۔ ایسے لوگ گویا اپنی ذات کی تعبیر اور اپنی بات کی تشریح کے لیے براہ راست ذرائع اختیار کرنے کے بجائے بالواسطہ طور طریقے سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ بھی اظہار ذات کی ایک قسم ہوئی اور جدید دور میں اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اس طرز کی خودنوشت سوانح عمریوں میں، جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے، اپنے زمانے کے تمام ادبی، فکری اور سیاسی رجحانات موجود ہوتے ہیں۔ بس اسلوب اور طریقۂ کار کا فرق ہو جاتا ہے۔[۱۳] چنانچہ جس طرح انیسویں صدی عیسوی میں رفاعہ طہطاوی، علی مبارک اور شدیاق نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں تعلیم کی ضرورت اور نئی تہذیب کو اسے اختیار کرنے کی دعوت دی اسی طرح مویلحی نے اپنے ناول 'حدیث علی بن ہشام' اور ابراہیم نے 'لیالی سطیح' میں اس کی ضرورت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ محمد حسین ہیکل کی کتاب 'زینب' میں اصلاح و تنقید کا یہ رنگ مزید گہرا ہوا۔ اس میں قاسم امین کی تحریک آزادی نسواں سے متاثر ہو کر معاشرتی اصلاح کی کوشش کی گئی ہے۔[۱۴] پھر توفیق الحکیم نے اپنی کتاب 'عودۃ الروح' پیش کر کے اس فکری اضطراب اور بے چینی کی بھرپور عکاسی کر دی جس سے اس زمانے کے مفکرین دوچار تھے۔ نوبت بہ ایں جاں رسید کہ اس کتاب میں انھوں نے اپنے ہم وطنوں کو فراعین مصر اور فرعونیت کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔[۱۵] اس کے بعد مازنی کے افسانوں اور ناولوں میں اس فکری اضطراب کی مزید تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں روشن خیالی، مغربیت زدگی اور فکری دیوالیہ پن کا مزید سامان ملتا ہے۔ ان تحریروں میں عورت کا رول کچھ زیادہ ہی ابھرا ہوا ہے۔ ہیکل کے ناول میں عورت محبت کے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتی تھی، لیکن یہاں وہ اظہار سے آگے بڑھ کر بقدر ضرورت لطف اندوز ہوتی ہے۔ عقاد کے ناول 'سارۃ' میں جدید عورت کا کردار اور زیادہ نمایاں ہوا ہے اب وہ صرف محبت ہی نہیں کرتی ہے، بلکہ اپنے پسندیدہ محبوب کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیتی ہے اور جب چاہتی ہے اسے اپنے دربار سے ٹھکرا دیتی ہے۔ گویا عقاد اپنے تجربات کی رو سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان کے زمانے کی عورت آزادی کے متوقع حدود سے بہت آگے بڑھ گئی ہے۔

جدید افسانوی خودنوشتوں میں ایک ہی کردار کی جو مختلف شکلیں نظر آتی ہیں اور مختلف امور و مسائل کے بارے میں متعدد فکری رخ نظر آتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں عرب اپنی شخصیت کی تلاش میں مختلف وادیوں میں بھٹکتے رہے اور کسی ایک بات پر ان کا اتفاق نہیں ہو پایا۔ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک فکری اضطراب سے دوچار تھے اور ان کی تحریروں میں اس اضطراب کی عکاسی ہو رہی تھی، خاص طور سے ان تحریروں میں جو دلی کیفیات اور اندرونی جذبات کی آئینہ دار ہوں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عربوں کا فکری انتشار آج بھی اسی طرح قائم ہے، بلکہ اب وہ کسی حد تک اپنی شخصیت اور حقیقت کی تلاش میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

۴- کسی مخصوص گوشۂ حیات سے متعلق خودنوشت سوانح عمریاں

اس صنف خودنوشت میں انشا پرداز اپنے کسی مخصوص گوشۂ حیات پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ گوشۂ ادب، فن، سائنس یا اس کے علاوہ کوئی اور ہوسکتا ہے۔ جدید عربی ادب میں بہت سے لوگوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنی پوری زندگی کو موضوع بنایا ہے، لیکن بعض نے اپنی زندگی کے کسی نمایاں پہلو کو۔ اس کی ایک مثال جرجی زیدان کی 'مذکرات' ہے، جس میں انھوں نے اپنے خاندان کے فقر و فاقہ، جہالت اور لاعلمی کا بڑی جرأت اور صاف گوئی سے تذکرہ کیا ہے۔[۱۶] یوسف وہبی کی مذکرات کا شمار بھی اسی قسم میں ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے ڈرامہ کے فن سے اپنی دلچسپی کے اسباب اور اس کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔ فن ڈرامہ ہی سے متعلق فاطمہ رشدی کی مذکرات بھی ہے۔

اس قسم میں وہ یادداشتیں بھی شامل کی جائیں گی جنھیں عرب ادیبوں نے اپنے بیرونی اسفار کے دوران تحریری شکل دی۔ اس میں انھوں نے اپنے مشاہدات اور ملاحظات قلم بند کیے ہیں۔ اس میں ان کی ذاتی زندگی کے کچھ احوال بھی آ گئے ہیں۔ اس طرح کے ادباء میں امین ریحانی، مازنی اور طٰہٰ حسین کے نام بطور مثال پیش کیے جا سکتے ہیں۔ حسین فوزی کی 'سندباد فی رحلۃ الحیاۃ'[۱۷] بھی اس نوعیت کی تصنیف ہے۔ اس میں انھوں نے ان حالات کی تصویر کھینچی

ہے جن سے گزر کر وہ زندگی کے اس مرحلے تک پہنچ چکے تھے۔

ان کے علاوہ شابی کی 'مذکرات'[۱۸] یحییٰ حقی کی 'خلیہا علی اللہ'[۱۹] اور توفیق الحکیم کی 'یومیات نائب فی الأریاف'[۲۰] بھی اسی قسم میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان تینوں ادباء نے حکومت کی تفویض کردہ ذمہ داریوں کے تحت مختلف دیہاتوں میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ بسر کیا۔ ان کی مذکورہ کتابوں میں یہی حصہ زیادہ غالب ہے۔ بقیہ زندگی کے دوسرے حصے برائے نام ہیں۔ ان سب نے دیہاتی زندگی کو مزید بہتر بنانے اور کسانوں کے حقوق و واجبات کا تحفظ کرنے کی پرزور وکالت کی ہے۔

مذکورہ بالا تصنیفات کے علاوہ بھی عربی زبان میں بہت سی دوسری تصنیفات ہیں جو اپنے لکھنے والوں کی ایک مخصوص تصویر پیش کرتی ہیں۔ دور حاضر میں تحریک الاخوان المسلمون کے متعلقین میں سے بعض نے راہ حق میں ابتلاء و آزمائش کی روداد یں قلم بند کی ہیں۔ یہ اگرچہ ان کی زندگی کے ایک مخصوص گوشہ (یعنی تحریک اور دعوتی جدوجہد) کو پیش کرتی ہیں، لیکن چونکہ یہ تحریریں خلوصِ قلب اور دل کی یکسوئی کے ساتھ لکھی گئی ہیں اس لیے اثر انگیزی اور سحر بیانی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان میں زینب الغزالی کی 'ایام من حیاتی' احمد رائف کی 'البوابۃ السوداء' اور عمر تلمسانی کی 'من سجل ذکریاتی' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اس پوری بحث میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ جدید عربی ادب میں خودنوشت نگاری کی تقریباً تمام اقسام پائی جاتی ہیں۔ قدیم عربی سرمایے میں بعض اقسام کی طرف غفلت برتی گئی تھی یا ان پر توجہ دی گئی لیکن ان کا حق ادا نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی تلافی جدید عربی ادب سے کسی حد تک ہوجاتی ہے۔ اب یہ ادب اس قدر مالا مال ہو چکا ہے کہ بجا طور پر عالمی ادب کی صف میں کھڑا ہونے اور ان کی ہم سری کرنے کے قابل ہوگیا ہے۔

حواشی ومراجع

۱۔ علی ادہم، علی ہامش الادب والنقد، دار الفکر العربی، قاہرہ، ص ۳۲

۲۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ ڈارون اور فرائڈ کے نظریات کو ایک حقیقت کے طور پر

دیکھا جارہا تھا۔ بعد میں ان کی یہ حیثیت باقی نہیں رہی۔ ان کی تائید وتردید میں تفصیل سے بحثیں ہوچکی ہیں۔ ان کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر بھی سامنے آچکا ہے۔

۳۔ Modern Arabic Literature, J.A Haywood, Landon, pp.163-166

۴۔ علی ہامش الادب والنقد ،ص۲۸-۲۹

۵۔ جرونیام، حضارۃ الإسلام، مکتبۃ مصر، ۱۹۵۶ء،ص۳۴۴-۳۴۸

۶۔ انیس المقدسی، الاتجاہات الأدبیۃ فی العالم العربی الحدیث، بیروت ۱۹۸۸ء،ص۳۵-۳۸

۷۔ میخائیل نعیمۃ، السبعون، ثلاثۃ اجزاء، دارصادر بیروت، ۱۹۵۹ء/ ۱۹۶۰ء

۸۔ طہ حسین، الأیام، الجزء الاول والثانی، دارالمعارف، مصر، ۱۹۵۵ء

۹۔ احمد شفیق، مذکراتی فی نصف قرن، القاہرہ، ۱۹۳۴ء

۱۰۔ قصۃ حیاتی، احمد لطفی السید، دارالہلال، قاہرہ ۱۹۶۲ء

۱۱۔ مذکرات کرد علی، مطبعۃ الترقی، دمشق ۱۹۴۸ء، ج۱،ص۳

۱۲۔ عبدالرحمان الرافعی، مذکراتی، دارالہلال، ۱۹۵۲ء،ص۳

۱۳۔ بدرالدین الحافظ، چند مصری ناول اور افسانے، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۱۹۸۶ء،ص۱۴۰

۱۴۔ محمد حسین ہیکل، زینب، ۱۹۵۹ء

۱۵۔ عودۃ الروح، قاہرہ، ۱۹۶۷ء

۱۶۔ الشعبۃ، قاہرہ، ۱۹۷۰ء

۱۷۔ طاہر الطناجی، عصامیون عظماء من الشرق والغرب، دارالہلال، ۱۹۴۴ء

۱۸۔ حسین فوزی، سندباد فی رحلۃ الحیاۃ، دار المعارف، ۱۹۶۸ء

۱۹۔ الشابی، مذکرات الشابی، دار التونسیۃ للنشر، ۱۹۶۶ء

۲۰۔ دارالکاتب العربی للنشر والطباعۃ (ب ت)

۲۱۔ مکتبۃ الآداب، قاہرۃ (ب ت)

☆☆☆